# پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار

پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کے کردار کے مثبت منفی پہلوؤں اوراس کے میزانیہ نفع ونقصان کے موضوع پر گفتگو سے قبل تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

ان میں سے دو باتیں تو سادہ بھی ہیں اور مختصر بھی، یعنی ایک یہ کہ یہاں سیاست کا وسیع تر مفہوم پیش نظر نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صرف انتخابی سیاست ہے جس میں حصہ لینے والی جماعتیں الیکشن لڑ کر اس کے نتیجے میں حزب اقتدار یا حزب اختلاف کا کردار ادا کرتی ہیں اور دوسری یہ کہ اس گفتگو میں مذہبی جماعتوں سے مراد بھی صرف وہ مذہبی جماعتیں ہیں جو الیکشن میں براہ راست حصہ لیتی ہیں، دوسری مذہبی جماعتیں، خواہ ان کی سرگرمیاں کتنی ہی وسیع ہوں (جیسے مثلاً تبلیغی جماعت) اور وہ انتخابات پر بھی بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہوں، اس گفتگو کے دائرے سے خارج ہیں۔ تیسری وضاحت جو کسی قدر تلخ بھی ہے اور تفصیل طلب بھی، یہ ہے کہ حقیقت واقعی کے اعتبار سے قومی سیاست کا وجود پاکستان کے ابتدائی چند سالوں کے بعد ہی ناپید ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کی سیاست کو ملکی سیاست تو قرار دیا جا سکتا ہے، قومی نہیں! چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس عاجز کے سامنے جیسے ہی یہ موضوع آیا اور اس نے اس پر اظہارِ خیال کے لیے غور شروع کیا، تو فوری طور پر ذہن اس روایتی لطیفے کی جانب منتقل ہو گیا کہ جب ایک ضعیف بصارت کے مریض کو ڈاکٹر نے کرسی پر بٹھا کر سامنے کی دیوار پر آویزاں چارٹ پر درج عبارت پڑھنے کو کہا تو مریض نے پوچھا ’’کون سا چارٹ؟‘‘ اور اس پر جب ڈاکٹر نے کہا ’’وہ جو سامنے کی دیوار پر لگا ہوا ہے!‘‘ تو مریض نے سوال کیا ’’وہ دیوار کہاں ہے؟‘‘...... حقیقت یہ ہے کہ بالکل یہی معاملہ پاکستان کی قومی سیاست کا ہے کہ ع ’’ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!‘‘ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ نے 1937ء سے 1947ء تک کے عرصے کے دوران مسلمان ہند کی عظیم قومی تحریک کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور پورے برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں کا اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا اتنا ظاہر و باہر اور اس قدر حتمی اور قطعی تھا کہ وقت کی برطانوی حکومت، انڈین نیشنل کانگریس ایسی عظیم سیاسی قوت اور جمعیت علمائے ہند ایسی بااثر مذہبی جماعتوں کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امر میں بھی ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس عظیم قومی جدوجہد کے دوران بھی مسلم لیگ اصلاً صرف ایک ’’تحریک‘‘ کی حیثیت رکھتی تھی اور اسے ایسی منظّم جماعت کی حیثیت حاصل نہیں تھی جس کے رہنماؤں اور کارکنوں کی صفیں اور درجے مرتب اور معین ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی پاکستان قائم ہوا مسلم لیگ پر اضمحلال طاری ہو گیا۔ اس ابتدائی اضمحلال کی تلافی کے لیے یہ مصنوعی صورت اختیار کی گئی کہ مسلم لیگ کی صدارت اور ملک کی وزارت عظمیٰ کو ایک ہی شخص میں جمع کر کے قومی جماعت کو حکومت کا سہارا دیا جائے۔ لیکن ع ’’مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی‘‘ یعنی اس کے بھی برعکس نتائج برآمد ہوئے اور اس طرح مسلم لیگ کی عوامی جڑیں کمزور پڑتی چلی گئیں، یہاں تک کہ جلد ہی وہ صرف سرکار دربار کی زیبائش وآرائش کا ذریعہ بن کر رہ گئی۔ ادھر مسلمہ قومی قیادت کے منظر عام سے ہٹنے اور قومی جماعت کے کمزور پڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کی ملکی سیاست صرف وڈیروں، جاگیرداروں، نوابوں اور قبائلی سرداروں کے ذاتی مفادات کا کھیل بن کر رہ گئی اور اس سے میدان سیاست میں جو دھما چوکڑی مچی اسے جواز بنا کر 1958ء میں پاکستان کی بری افواج کے کمانڈر انچیف نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لی۔ وہ دن اور آج کا دن، پاکستان میں اقتدار کے دو مستقل ستونوں کی حیثیت فوج اور سول بیوروکریسی کو حاصل ہے۔ رہے نام نہاد سیاستدان جن کی غالب اکثریت وڈیروں اور جاگیرداروں پر مشتمل ہے تو وہ اس اقلیم سیاست کے دوسرے درجہ کے شہری ہیں جو لیبل بدل بدل کر مختلف سیاسی جماعتوں کی صورت اختیار کرتے رہتے ہیں اور فلمی دنیا کے ایکٹرا اداکاروں کے مانند منتظر رہتے ہیں کہ ایوان اقتدار کے اصل قابضین میں سے کس کی نگاہ کرم کب اور کس پر پڑتی ہے جو کچھ دیر کے لیے ’’جسے پیا چاہیں، وہ سہاگن‘‘ کے مطابق حریم اقتدار میں داخل ہو سکے۔ گویا اس تجزیے کے مطابق تو پاکستانی سیاست میں نام نہاد قومی سیاسی جماعتوں کا کردار بھی ثانوی ہے۔ تو ’’تا بہ دیگراں چہ رسد؟‘‘ اور ع ’’قیاس کن زگلستان من بہار مرا!‘‘ کے مصداق تیسرے نمبر پر شمار ہونے کے قابل علاقائی اور لسانی تنظیموں اور پھر ان کے بھی بعد چوتھے نمبر پر آنے والی مذہبی جماعتوں کے مثبت اور مستقل سیاسی رول کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ پاکستان کی چھیالیس سالانہ تاریخ کے دوران صرف ایک مذہبی جماعت کے قائد نہایت مختصر مدت کے لیے پاکستان کے سب سے چھوٹے صوبے کے وزیر اعلیٰ رہے اور وہ بھی ان لوگوں کے سہارے جو علماء دین کے لیے اعلانیہ طور پر نہایت رکیک اور توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسری جماعت کو پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں قابل لحاظ عرصے کے لیے اقتدار حاصل رہا لیکن صرف بلدیات کی حد تک! البتہ ایک دوسرے اعتبار سے مذہبی جماعتیں پاکستان کی سیاست میں نہایت نمایاں اور موثر بلکہ فیصلہ کن کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ اگرچہ اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ رول مثبت اور مفید رہا یا منفی اور مضر!...... ہماری مراد مختلف مواقع پر اٹھنے والی احتجاجی تحریکوں سے ہے جن کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً ایوان حکومت میں زلزلے آتے رہے اور پاکستان میں اقتدار کی مستقل مثلث زاویے بدلتی رہی۔ چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایوب خاں کے خلاف برپا ہونے والی ایجی ٹیشن میں بھی سب سے موثر کردار مذہبی جماعتوں کا تھا۔ بعدازاں بھٹو صاحب کے اقتدار کے خاتمے کا سہرا بھی اصلاً مذہبی جماعتوں ہی کے سر تھا، اور اسی طرح نواز شریف اور بے نظیر کی حکومتوں کے خاتمے اور پھر الیکشن میں شکست کا کریڈٹ بھی سب سے بڑھ کر مذہبی جماعتوں کو ہی جاتا ہے اور اس کا سبب بھی بالکل واضح ہے کہ عوام کو قربانی پر آمادہ کرنے والا سب سے موثر جذبہ مذہبی ہی ہوتا ہے جس کے زیر اثر لوگ جانیں دے دینے کو سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ ؎ ’’منحصر مرنے پہ ہو جس کی

امید، ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے!'' کے مصداق احتجاجی مہموں اور مظاہراتی سیاست کے لیے ایسے لوگوں سے بڑھ کر کون موزوں ہوسکتا ہے! تاہم جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے اس رول کے مثبت یا منفی ہونے کا فیصلہ کرنا اس کا میزانیہ نفع ونقصان مرتب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے کہ جہاں یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہے کہ ان احتجاجی تحریکوں کے نتیجے میں ایسی حکومتوں کا خاتمہ ہوگیا جو مختلف طبقات کو مختلف وجوہات کی بناء پر ناپسند تھیں، وہاں اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اس سے نہ اسلام کو کوئی حقیقی اور واقعی فائدہ پہنچا، نہ مذہبی جماعتوں کو کچھ حاصل ہوا۔ بلکہ اینٹی ایوب ایجی ٹیشن کی کمائی بھٹو صاحب نے کھائی اور اینٹی بھٹو ایجی ٹیشن کا فائدہ جنرل ضیاء الحق نے اٹھایا۔ گویا ع ''مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی!'' اس پر مستزاد یہ کہ ان تحریکوں کے نتیجے میں پاکستان میں سیاسی عمل کی گاڑی بار بار پٹڑی سے اترتی رہی۔ جس کے باعث عوام کا سیاسی شعور بھی ناپختہ اور نابالغ رہا۔ اور سیاسی ادارے بھی مسلسل شکست و ریخت کا شکار رہے! پاکستان میں قومی سیاست کے ضعف یا فقدان کے اسباب کا ذرا گہرا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہہ میں یہ عقدہ لاینحل بھی کارفرما نظر آتا ہے کہ حصول پاکستان کی تحریک مسلم قومیت کی بنیاد پر چلی اور اس کے دوران عوامی سطح پر سب سے زیادہ زوردار نعرہ اسلام کا لگایا گیا...... لیکن جب پاکستان قائم ہوگیا تو ع ''جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں تھا!'' کے مصدق جو واقعی صورتحال اور ٹھوس حقائق سامنے آئے وہ یہ تھے کہ اس میں آباد لوگوں کی غالب اکثریت میں اسلام کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی تو تھی لیکن سیرت و کردار اور اعمال و اخلاق کا حال ۔ ''وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ھنود، یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!'' کا مصداق اتم تھا یا اس سے بڑھ کر ۔ ''جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں۔ ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں'' اور ۔ ''جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں ☆ بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!'' کی تصویر کامل!...... بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک صورتحال یہ تھی کہ عوام تو پھر بھی کم از کم عقیدے کی حد تک اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور حدیث، اور جنت اور دوزخ کے قائل تھے لیکن تعلیم یافتہ طبقات کا معتد بہ حصہ، جو قومی معاملات میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل تھا ۔ ''ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم، کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ'' کا منہ بولتا ثبوت اور ع ''میرے اسلام کو اک قصہ ماضی سمجھو!'' کی مجسم تصویر تھا...... اب ظاہر ہے کہ ''جذبات'' کے بل پر تو ''تحریکیں'' چلا کرتی ہیں، سیاست میں تو اس کے بالکل برعکس ٹھیٹھ حقائق اور ٹھوس واقعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی چھیالیس سالہ تاریخ کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو وہ ایک جانب ان ہی ٹھوس حقائق واقعی اور دوسری جانب مذہبی جذبات اور امنگوں کی رسہ کشی کا مظہر نظر آتی ہے اور نصف صدی کے لگ بھگ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی اگر حالات و واقعات کے بین السطور قائم حقیقت ہیں سے مشاہدہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک جانب ہمارے معاشرے کی عمومی اور اقتدار اور تعلیم یافتہ اور مقتدا طبقات کے مجموعی تصورات اور رجحانات ہیں جن پر عہد حاضر کی عالمی تہذیب کے زیر اثر مادہ پرستی، الحاد اور اباحیت کی گہری چھاپ ہے، جن کا تقاضا ہے کہ ملک مغرب کے مروجہ تصورات کے مطابق وطنی قومیت کے اصول پر مبنی ریاست قرار پائے اور مغرب کے سیاسی اور اقتصادی نظام کو سماجی اور تہذیبی اقدار سمیت جوں کا توں اختیار کر لیا جائے اور دوسری طرف مذہبی طبقات اور سیاست کے میدان میں برسر عمل مذہبی جماعتیں ہیں جو عوام کے مذہب کے ساتھ جذباتی لگاؤ کے سہارے قانون شریعت کی تنفید اور اسلام کی تہذیبی اقدار کی ترویج کی جانب زور لگا رہی ہیں۔ اس رسہ کشی کے ضمن میں مذہبی جماعتوں کا یہ دعویٰ تو یقیناً صحیح ہے کہ اگرچہ ہم پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور قوانین شریعت کے نفاذ میں تاحال کامیاب نہیں ہوسکے لیکن ہماری میزان نتائج میں نفع اور کامیابی کے پلڑے میں یہ وزن کیا کم ہے کہ ہم نے یہاں سیکولر نظام کی جڑیں بھی مضبوط نہیں ہونے دیں لیکن قومی اور ملکی سطح پر یہ بات قابل غور ہے کہ اس منفی کامیابی (اگر اسے کامیاب قرار دیا جاسکے!) کی قیمت اگر قومی سیاست کے تعطل کی صورت میں ادا کی جاتی رہی تو شاید ملک ہی ع ''آں قدح بشکست وآں ساقی نماند!'' کے مصداق حصے بخرے ہوکر ختم ہوجائے اور وہ شاخ ہی باقی نہ رہے جس پر نظام اسلام اور قانون شریعت کے آشیانے بنائے جاسکیں۔ گویا اس رسہ کشی کے جاری رہنے میں اس بات کا بھی اندیشہ موجود ہے کہ رسہ ہی بیچ میں سے ٹوٹ جائے...... مزید برآں اس تعطل میں بھی خلاء تو بہرحال موجود نہیں ہے اور اس کے معنی بھی تو یہی ہیں کہ جاگیرداری نظام بھی جوں کا توں برقرار رہے اور سودی معیشت بھی علی حالہ قائم ودائم ہے اور نفاذ شریعت ایکٹ بھی نافذ ہوا ہے تو ایسا جسے جملہ مذہبی جماعتوں نے ''انسداد شریعت ایکٹ'' قرار دیا ہے۔ رہی بات مغربی معاشرت اور اس کے لوازم یعنی عریانی، بے حیائی اور فحاشی تو وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی رہے ہیں! حاصل کلام یہ کہ انتخابی سیاست کے میدان میں سرگرم مذہبی جماعتوں کو اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے۔ چنانچہ بعض جماعتیں اس وقت اس انداز سے سوچ بھی رہی ہیں۔ لیکن بحالات موجودہ یہ اندیشہ وہمی اور خیالی نہیں ہے کہ وہ کسی ردعمل کا شکار ہوکر دوسری انتہا کی جانب نکل جائیں اور ماحول کو کم از کم حد تک سازگار بنائے بغیر اور خود اپنی صفوں کی ترتیب واستواری اور کارکنوں کی تربیت اور تزکیے کے ناگزیر تقاضے پورے کیے بغیر تصادم کی راہ اختیار کرلیں۔ جس کا نتیجہ ملک وقوم کے حق میں تباہ کن ہوگا اور دین ومذہب کے لیے بھی نہایت افسوسناک!...... بنابریں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس منہج نبویؐ کو اچھی طرح سمجھا جائے جس کے ذریعے تاریخ انسانی کا پہلا اسلامی انقلاب برپا ہوا تھا اور جسے اختیار کیے بغیر ع ''خدایا! آں کرم بارے دگر کن!'' کی آرزو شرمندہ تکمیل نہیں ہوسکتی!